لالوکھیت کا خلیفہ

○

ابن صفی نے جب پاکستان ہجرت کی تو سب سے پہلے لالوکھیت میں رہائش اختیار کی ۱۹۵۳ء میں ایک پُر لطف ملاقات کا احوال — ابن صفی کی ایک شاھکار طنزیہ تحریر

میں نے اُسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایک سیاسی جماعت کے انتخابی جلسے میں دھواں دار تقریر کر رہا تھا۔ مجھے نہ اپنی سماعت پر یقین آ رہا تھا اور نہ بصارت پر، کیا یہ وہی ہے؟

میرے ذہن نے ماضی میں چھلانگ لگائی۔ ۱۹۵۳ء کی بات ہے جب نیا نیا کراچی پہنچا تھا، نہ اپنا کوئی حلقہ تھا اور نہ کوئی ایسی چوپال ہی نصیب تھی جہاں شام کا کچھ وقت گزارا جا سکتا۔ دن ڈھلتے ہی دم گھٹنے لگتا کہ دیکھیے شام کیونکر گزرے... لیاقت آباد اُن دنوں لالوکھیت کہلاتا تھا اور یہاں لالو کم اور کھیت زیادہ تھے۔ ۱۹۵۳ء میں یہ علاقہ اتنا گھنا آباد تو نہیں تھا۔ جگہ جگہ لمبی چوڑی زمینیں خالی پڑی تھیں، بازاروں میں خاک اُڑتی تھی۔ اسی لالوکھیت میں اسّی گز کے ایک پلاٹ پر کرایہ دار کی حیثیت سے اپنا بھی قیام تھا۔

بہرحال سرِشام اللہ کا نام لے کر گھر سے نکل پڑتا اور سڑکیں ناپتا پھرتا۔ ایک دن اختلاجِ قلب نے تفریح کی ایک نئی راہ دکھائی اور میں ایک اچھے بھلے آدمی کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

"السلام علیکم!"

اجنبی کے چہرے پر اُلجھن کے آثار دیکھ کر خاصا محظوظ ہوتا ہوا بولا۔ "آپ یہ نہ سمجھیے گا محترم کہ مَیں ملتان سے یہاں اپنے بھائی سے ملنے آیا تھا لیکن یہاں پہنچ کر نہ صرف یہ معلوم ہوا کہ بھائی نہ صرف تبادلے پر کوئٹہ چلا گیا ہے بلکہ میری جیب بھی کٹ چکی ہے۔ لہٰذا براہ کرم واپسی کا کرایہ عنایت فرمائیے اگر اللہ پاک

آپ کو اس کا اجر نہ دے گا تو میں خود ملتان پہنچ کر آپ کے روپے بذریعہ منی آرڈر واپس کر دوں گا!''
وہ بے چارہ کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ''جی نہیں — جی نہیں — تو پھر فرمایئے —!''
''دو کتے بھی قریب سے گزرتے ہوئے غرّاتے ہیں —!''
''جی ہاں — جی ہاں —!''
''تو پھر ابنِ آدم کیوں خاموشی سے گزر جائے — آپ گھبرایئے نہیں۔ مرشد کا بخشا ہوا سُرمہ بصارت بھی آپ کے گلے نہیں لگاؤں گا!''
''اچھا — اچھا —!'' اس کی نروس سی ہنسی بدستور جاری رہی۔
''چلئے کہیں بیٹھ کر چائے پئیں گے!''
اس کے چہرے پر ہچکچاہٹ کے آثار اُبھرے ہی تھے کہ میں نے بڑی بے تکلفی سے اس کے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا تھا۔ ''چلئے چلئے — ہم صدیوں سے ایک دوسرے کے آشنا ہیں — آدم کے بیٹے —!''
''چچ — چلئے —!'' وہ ہکلایا۔ وہ ایک خوش شکل اور سفید پوش آدمی تھا۔ پڑھا لکھا بھی لگتا تھا۔ میں نے سوچا اسے متحیر کر کے اچھی خاصی شام گزار لوں گا۔
ہم ایک چائے خانے میں جا بیٹھے — وہ بار بار کن انکھیوں سے میری طرف دیکھنے لگتا تھا۔
''آپ کیا کھائیں گے؟'' دفعتہً میں نے سوال کیا۔
''جج — جی کچھ نہیں — بس چائے منگوا لیجیے!''
''یہ کیا بات ہوئی — محض ایک کپ چائے کے لیے میں نے آپ کو اتنی دور تک نہیں ٹہلایا ہے!''
''تت — تو — پھر —؟'' اس پر ابھی تک بوکھلاہٹ طاری تھی۔
''اچھا —!'' میں اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ''آپ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ کھا پی کر خود کھسک جاؤں گا اور آپ ہوٹل والے کے رحم و کرم پر ہوں گے!''
''ہرگز نہیں — ہرگز نہیں —!'' وہ نروس سی ہنسی کے ساتھ بولا۔
''لڑکے —!'' میں نے بیرے کو آواز دی، وہ دوڑتا ہوا آیا تھا۔
''جی صاحب —!''
''پیسٹریاں، سموسے اور چائے — اور دو کپ کی اسپیشل —!''
وہ چلا گیا اور اجنبی ہکلایا۔ ''آپ خواہ مخواہ۔ ززز۔ زحمت کر رہے ہیں جناب —!''
''اے میرے باپ کے بیٹے! ہم اجنبی نہیں ہیں!'' میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''یہاں سے ہزار میل دور بیٹھا ہوا ایک سیاہ فام افریقی بھی میرے لیے اجنبی نہیں — وہ تو والدہ صاحبہ کی

حماقت کی وجہ سے دنیا میں آنا پڑا۔ ورنہ جنت ہی میں مزے کر رہے ہوتے—!''

''وَ وَ— والدہ صاحبہ!'' وہ ہکلایا۔

''اَرے ماں— ماما حوّا— شیطان کے بہکانے میں آ گئی تھیں نا!''

اس کی ہنسی عجیب تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے خود کو کسی پاگل کے پھندے میں پھنسا ہوا محسوس کر رہا ہو۔ ڈرتا ہو کہ کہیں اچانک پاگل کا رویہ جارحانہ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ اس لیے دانت نکلے ہی رہیں تو بہتر ہے۔

لڑکا پیسٹریاں اور سموسے لے آیا تھا۔ ایک بار پھر اجنبی کے چہرے پر حیرتوں کی یورش ہو گئی۔ کئی عدد پیسٹریاں ڈھیر سارے سموسے تھے۔

''اُف فوہ کھائیے نا!'' میں نے کہا۔ ''کھانے کھلانے کے بعد آپ سے یہ بھی نہیں کہوں گا کہ اپنا ووٹ چرخے کے نشان والے شیخ بندے علی کو دیجئے گا!''

''کمال ہے— ہی ہی ہی— !'' اس نے ہنستے ہوئے شرما کر پیسٹری کی پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''یہ کیسی عجیب بات ہے!'' میں جھکّیوں کے سے انداز میں بکواس کرتا رہا۔ ''ہم اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے کے قریب سے گزر جاتے ہیں کیا قیامت ہے— آدم کے بیٹوں نے اپنے درمیان کیسی کیسی دیواریں کھڑی کر لی ہیں— سوتے جاگتے کا قصہ پڑھا ہے آپ نے— الف لیلیٰ کی کہانی!''

''جج— جی ہاں— !'' وہ پیسٹریوں کی پلیٹ صاف کر کے سموسوں کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوا بولا۔ ''بچپن میں پڑھی تھی!''

''تو میں لالوکھیت کا خلیفہ ہارون الرشید ہوں، سمجھے— !'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اب شاید وہ سوچنے لگا تھا کہ سموسہ کھائے یا نہ کھائے۔ پتا نہیں کیا اُفتاد پڑے۔ آدھا منھ میں اور آدھا ہاتھ میں لے کر کہیں بھاگنا ہی نہ پڑ جائے۔

''کھائیے— کھائیے— !'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''پاگل نہیں ہوں۔ ہوٹل والے سے پوچھ لیجیے۔ روزانہ شام کو یہیں بیٹھتا ہوں!''

''جج۔ جی— ہی ہی— نہیں— !'' وہ دلجمعی سے کھانے لگا۔

''اُبلا ہوا انڈا بھی منگواؤں— ؟''

''...آپ کہتے ہیں تو منگوا لیجیے— !''

''لڑکے— دو اُبلے ہوئے انڈے بھی— !'' میں نے ہانک لگائی اور اس سے کہا۔ ''سُنیے ایک معرکے کا شعر بھی سنیے— !''

''سُس سنائیے—!''

مرغیاں کب نکاح کرتی ہیں

پھر تو انڈا حرام ہے پیارے

اتنے زور سے ہنسا تھا کہ سموسہ منہ سے نکل کر میری گود میں آ پڑا۔

''کوئی بات نہیں— کوئی بات نہیں—!'' میں نے کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔

اتنی دیر میں سموسے کی پلیٹ بھی صاف ہوگئی—لڑکا انڈے لے آیا تھا۔

''ایک آپ بھی لیجیے—!'' اجنبی نے ایک عدد پر قبضہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں تو پہلے ہی بصورت شعر عرض کر چکا ہوں، کیونکہ مرغ شادی بیاہ کا قائل نہیں ہے۔ اس لیے میں انڈا بھی نہیں کھاتا—!''

''اچھا— اچھا—!'' اس نے ایسے انداز میں کہا جیسے سچ مچ ایک عجیب اُلّو پھنس گیا ہو۔ اُس کے مقدر سے۔

دوسرا انڈا بھی اُس کے حلق کے نیچے اُتر گیا— پھر میں نے چائے منگوائی۔ ہم چائے پیتے رہے تھے اور اب وہ بھی چہکنے کے موڈ میں آ گیا تھا—

''آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی—اپنا پتہ لکھوا دیجیے— کبھی کبھی حاضر ہوتا رہوں گا!''

''خلیفہ ہارون الرشید—لالوکھیت—!''

وہ پھر ہنس پڑا— چائے کے اختتام پر میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر افسردگی طاری ہوگئی ہے— ہونٹ کانپ رہے ہیں— اور آنکھیں نم آلود ہوگئی ہیں پھر دو موٹے موٹے قطرے اُس کے رخساروں پر ڈھلک آئے تھے—!

''ہائیں خیریت— کیوں— کیوں؟'' میں سچ مچ بوکھلا گیا۔

''جی کچھ نہیں—!'' اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور اپنے آنسو پونچھنے لگا۔

''نہیں بھئی بتائیے— آپ نے تو الجھن میں ڈال دیا—!''

''کیا بتاؤں!'' اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''مجھ کمبخت نے تو اپنا پیٹ بھر لیا— لیکن میرے چھوٹے چھوٹے بچے تین دن کے فاقے سے ہیں—!''

پیروں تلے سے زمین نکل گئی— ہارون الرشید کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ کر کارنس پر جا بیٹھے اور ایک ساتھ بولنے لگے۔ ''پیر نبی جی بھیجو— مٹھو میاں— مٹھو میاں'' میں پیسٹریوں، سموسوں اور انڈوں کا حساب دل ہی دل میں لگا تا رہا تھا۔ تو گویا ادائیگی کے بعد میری جیب میں صرف دس کا ایک نوٹ باقی بچے گا۔ اُدھر

اس آدم زاد بھائی نے ہچکیاں اور سسکیاں بھی لینی شروع کر دی تھیں۔ اب میرے نروس ہو جانے کی باری تھی۔ مجھ سے نہ عورت کے آنسو برداشت ہوتے ہیں اور نہ مرد کے، بوکھلا کر دس کا نوٹ نکالا اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''اللہ آپ کا بھلا کرے!'' اس نے نوٹ تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''اب اجازت دیجیے تاکہ ان بدبختوں کے لیے فوری طور پر کچھ نان کباب خرید سکوں—!''

''ضرور— ضرور—!'' میں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ نہایت اطمینان سے اُٹھا اور باہر چلا گیا— میں احمقوں کی طرح خلا میں گھورے جا رہا تھا۔

آج پورے تیرہ سال بعد میں نے اسے پھر دیکھا تھا— وہ ایک جمہوریت نُما آمریت کو برقرار رکھنے کے لیے کنویسنگ کر رہا تھا۔

''قائداعظم کے بعد ملک کو پہلی بار صحیح قیادت نصیب ہوئی ہے۔ بنیادی جمہوریت کا نظام خالص اسلامی نظام ہے۔ قبائل کے سردار کسی ایک کے ہاتھ پر بیعت کر کے خلیفہ منتخب کرتے تھے— سردار کی بیعت پورے قبیلے کی بیعت سمجھی جاتی تھی— عوامی بھیڑ چال والی جمہوریت اسلام میں کبھی نہیں رہی— اب قبائلی زندگی تو رہی نہیں لیکن ایک طرح سے آپ پہلے اپنے سردار یعنی بنیادی جمہوریت کے ممبر کا انتخاب کرتے ہیں— اور وہ جسے ووٹ دیتا ہے، وہ خلیفۃ المسلمین بنتا ہے—!''

''ہیئر ہیئر—!'' تالیاں— ''ہیئر، ہیئر—!''

میں حیرت سے منہ پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا— دیکھتا رہا— اس کے الفاظ کانوں میں ضرور پڑ رہے تھے— لیکن میرے اپنے ذہن کی جھائیں جھائیں انہیں مفہوم سے بے نیاز کیے دے رہی تھی۔

اس کی تقریر ختم ہوئی— اور وہ ڈائس سے اُتر کر نیچے سامعین میں آبیٹھا۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ شاید اس سے ملنا چاہتا تھا—

اور پھر مجھے اس کا موقع مل ہی گیا— وہ جلسہ گاہ سے نکل رہا تھا۔ اس کے پیچھے دو آدمی مؤدبانہ چل رہے تھے۔

''السلام علیکم—!'' میں نے قریب پہنچ کر کہا۔

وہ رک کر مڑا اور مجھے تیز نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔ ''فرمایئے—!''

اس وقت اس کی نظروں کی تاب لانا کم از کم میرے بس کا روگ تو نہیں تھا۔ لہٰذا مجھ پر بوکھلاہٹ کا دورہ پڑ گیا— بالکل غیر ارادی طور پر میری زبان سے نکلا تھا۔

''جج— جنابِ عالی— مم— میرے بچے— تین دن کے فاقے سے—!''

''ہاؤں—!'' وہ دہاڑا— ''تم سفید پوشوں کا ابھی تک کوئی انتظام نہیں ہوا— عام گداگروں کو پکڑ کر کیمپوں میں بھیجا جا رہا ہے— گُلن خان!''

''جی حضور—!'' گُلن خان عقب سے بولے۔

''ذرا دیکھنا تو آس پاس کوئی ڈیوٹی کانسٹیبل موجود ہے—!''

کانسٹیبل کا نام سُن کر میری جان نکل گئی— اور پھر جو وہاں سے سرپٹ بھاگا ہوں تو آج تک اسی دوڑ میں ہوں— میری سانس پھول رہی ہے اور ہر بُن مو سے پسینہ جاری ہے۔

بے چارہ لالوکھیت کا خلیفہ ہارون الرشید—!

□□□